

قرآن کی سیاسی و معاشی تعلیمات اور تاریخِ عالم

پروفیسر عبدالقدیر سلیم^o

مسلمانوں کا دعویٰ ہے کہ قرآن مجید ایک عہد آفرین کتاب ہے۔ اس کتاب کے نزول اور پھر اس کی اشاعت کے بعد دنیا وہ نہ رہی، جو اس سے قبل تھی اور نہ پھر کبھی وہ بن سکے گی۔ لیکن یہ دعویٰ تو اُس قوم کا ہے، جو اس کے الہامی اور من جانب اللہ ہونے کو بحیثیت نقطہ آغاز تسلیم کرتی ہے۔ جو لوگ اس بنیادی مقدمے ہی کو تسلیم نہیں کرتے کہ یہ کُل انسانیت کے نام اللہ کا آخری پیغام اور اس کی ہدایت کا غیر مُبدّل ذریعہ ہے، اُن کے لیے اس دعوے کو جانچنے کا کیا ذریعہ ہو سکتا ہے؟ میرے خیال میں اس کے متعدد ذرائع ہو سکتے ہیں، اور مختلف زاویوں سے ہم اس مسئلے کی طرف توجہ کر سکتے ہیں، مثلاً قرآن مجید کی ان پیش گوئیوں ہی کو لیجیے:

لَا غَلْبَةَ لَنَا وَرُسُلِي (المجادلہ ۵۸:۲۱) میں اور میرا رسول غالب آکر ہی رہیں گے۔

إِنَّا أَعْطَيْنَاكَ الْكُوثَرَ ۝ فَصَلِّ لِرَبِّكَ وَانْحَرْ ۝ إِنَّ شَانِئَكَ هُوَ الْأَبْتَرُ ۝

(الکوثر ۱۰۸:۱-۳) اس میں کوئی شبہ نہیں ہے کہ ہم نے تمہیں خیر کثیر عطا کر دیا ہے

پس تم اپنے رب کے لیے نماز پڑھو اور قربانی کرو، بلاشبہ تمہارا دشمن ہی بے نشان ہوگا۔

قرآن مجید میں یہ دعوے اللہ تعالیٰ سے منسوب ہیں۔ اب سے ۱۴ سو سال پہلے صحراے

عرب میں ایک شخص کھڑے ہو کر یہ دعویٰ کرتا ہے کہ وہ اللہ کا پیامبر ہے، اور پوری انسانیت کے

لیے ہادی اور راہنما ہے۔ وہ کوئی جمہوری دَور نہیں تھا، جب اختلافِ رائے و عقیدہ آسانی سے

o پروفیسر کوس انسٹی ٹیوٹ آف ایمرٹنگ سائنسز ایڈریس ایجوکیشن، کراچی

برداشت کر لیے جاتے ہوں۔ اب ہوتا یہ ہے کہ چاروں طرف مخالفت کا بازار گرم ہو جاتا ہے۔ جو کل دوست تھے، آج دشمن ہیں۔ قبائلی نظام میں کسی فرد کی سب سے بڑی قوت اس کے قبیلے کی پشت پناہی ہی ہوتی ہے۔ مگر یہاں تو یہ حال ہے کہ اس دعوت کی سب سے زیادہ مخالفت اور مزاحمت اس کے اپنے قبیلے اور خصوصاً اس کے بااثر سرداروں ہی کی طرف سے ہوتی ہے۔ حقیقت تو یہ ہے کہ اس عہد کے کسی دانا انسان کے ذہن میں بھی یہ بات نہیں آ سکتی تھی کہ تاریخ اب کسی نئے موڑ پر مڑنے والی ہے۔ اور تو اور آج کا کوئی بڑے سے بڑا مورخ یا فلسفی تاریخ بھی ابتدا سے تاریخ اقوام کا گہری نظر سے مطالعہ کرتا ہوا آئے تو چھٹی صدی یا ساتویں صدی عیسوی کی ابتدا میں، اقوام عالم میں اُسے کوئی ایسی غیر معمولی حرکت نہیں دکھائی دے گی، جس کی بنا پر وہ ایک عالم گیر سیاسی انقلاب کی پیش گوئی کر سکے، جس سے صدیوں پرانی سلطنتیں منہدم ہو جائیں، یا کسی ایسے معاشرتی، اخلاقی اور مذہبی انقلاب کا پتا چل سکے، جس نے نہ صرف ہزار ہا سال کے انسانی تصورات اور معجزات کو ہلا کر رکھ دیا، بلکہ انسان کی فکری تاریخ پر ایسے گہرے نقوش چھوڑے کہ اُن کے اثرات اور اثرات کے اثرات نے عالم فکر میں ایک زنجیری ردِ عمل برپا کر دیا ہے۔ ایسا عمل، جو آج بھی جاری ہے۔

آج سے کوئی پندرہ سو سال قبل جب کسی کتاب نے ایسا دعویٰ کیا، تو سوائے اُس شخص کے جو یہ کتاب لے کر آیا، اور اُن چند مٹھی بھرا انسانوں کے جو اُس کی صداقت کے قائل ہو گئے تھے، کسی کو اس کا یقین نہ تھا۔ اور یہ عدم یقین، تاریخ اسلام کے ایک مشہور واقعے سے بخوبی ظاہر ہوتا ہے۔ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے تبلیغ دین کے ابتدائی ایام میں اہل قبیلہ کی دعوت کا اہتمام کیا، اور اس کے بعد دعوت اسلام پیش کی۔ سب خاموش رہے۔ حضرت علیؓ، جو اس وقت بچے تھے کھڑے ہوئے اور بولے: ”اگرچہ میری ٹانگیں پتلی ہیں (یعنی میں کمزور ہوں) اور آنکھوں میں آشوب ہے، تاہم میں آپے کا ساتھ دوں گا۔“ آپے کا چچا ابولہب بولا: ”یہ چہل سالہ بوڑھا اور یہ لڑکا دنیا کو بدلنے چلے ہیں!!“^۱

قرآن مجید کے انقلابی اثرات کا جائزہ ایک دوسرے انداز میں بھی لیا جاسکتا ہے۔ ایک

جگہ کہا گیا ہے:

وَقِيلَ لِلَّذِينَ اتَّقَوْا مَاذَا أَنْزَلَ رَبُّكُمْ قَالُوا خَبِرَ الَّذِينَ أَحْسَنُوا فِي هَذِهِ الدُّنْيَا حَسَنَةً ۖ وَلِذَٰرِ الْأَخِرَةِ خَيْرٌ ۖ وَلَنِعْمَ دَارُ الْمُتَّقِينَ ۝ (النحل: ۱۶: ۳۰) اور جب اُن لوگوں سے جنہوں نے تقویٰ اختیار کیا ہے، کہا جاتا ہے کہ تمہارے پروردگار نے کیا نازل کیا ہے؟ تو وہ کہتے ہیں: ”ہمارے رب نے خیر نازل فرمایا ہے“۔ وہ لوگ جنہوں نے اعمالِ حسنہ کیے ہیں، اُن کے لیے اس دنیا میں بھی بھلائی ہے، اور آخرت کا گھر تو بہتر ہے ہی، اور اہل تقویٰ کا ٹھکانا ضرور ہی اچھا ہوگا۔

یہاں قرآن مجید میں خود مسلمانوں کے منہ سے اس کی کُل تعلیمات کے لیے ایک نہایت جامع لفظ ’خیر‘ استعمال کرایا گیا ہے۔ گویا قرآن مجید میں جو کچھ تلقین و تعلیم ہے، سراسر خیر ہی خیر ہے۔ اس میں تمام انسانیت کی بھلائی مضمر ہے۔

آئیے ایک نظر حیاتِ انسانی کے اہم انفرادی و اجتماعی اداروں اور نظاموں پر ڈال کر دیکھیں کہ قرآن مجید کی تعلیمات سے وہ کس طرح اور کس حد تک متاثر ہوئے ہیں۔ اس گفتگو کے لیے ہم نے فی الحال صرف دو اداروں، سیاست و معیشت کو منتخب کیا ہے، ورنہ قرآن مجید کے اثرات تو انسانی زندگی پر ہمہ گیر ہیں۔ تصورِ مذہب، اخلاق، علم و تعلیم اور معاشرت پر اس کے اثرات کا کُلی طور پر احاطہ کر لینا تقریباً ناممکن ہے۔

قرآن مجید کی تعلیمات کے سیاسی اثرات کو ملاحظہ کرنے کے لیے اس عہد کے فلسفہٴ سیاست پر ایک نظر ڈالنا ہوگی:

• انسانی تاریخ کے اسٹیج سے پہلے پہل جب پردہ اٹھتا ہے تو شرقِ اوسط اور مصر کی اقوام منصفہ شہود پر نظر آتی ہیں۔ ان تہذیبوں میں جمہوریت یا عوامی حکومت کا کوئی تصور نظر نہیں آتا۔ حکومتیں خاندانی یا موروثی ہوتی تھیں۔ قدیم بابل اور آشور یا میں حکمران کا اقتدار مطلق ہوتا تھا۔ مطلق العنان حکمرانوں کو اپنے عوام کی زندگی اور موت پر کُلی اختیار تھا۔ حکومت کی پالیسی، قانون سازی، اس کے نفاذ کے ادارے، سب انھی کے کنٹرول میں ہوتے تھے۔ اگر کوئی تحدید تھی، تو بعض رسوم و رواج کی، یا طاقت و رقبا کی سرداروں یا اشرافیہ کی بغاوت کے خطرے سے تھی۔ عوام کے کوئی حقوق کہیں نظر نہیں آتے۔ اُن کی قسمت کا دار و مدار کلیتاً اس بات پر تھا کہ جو شخص تخت پر قبضہ کر لیتا

ہے، وہ ظالم، جابر اور لاپرواہ ہے، یا اس کے دل میں رحم دلی کی کوئی رمت باقی ہے۔

● دنیا میں جمہوریت کا عکس سب سے پہلے ہمیں یونان میں نظر آتا ہے۔ ۷۰۰ قبل مسیح میں انتھنز میں موروثی بادشاہت کے بجائے بعض اشراف کی حکومت کا بیج پڑا۔ اشرافیہ کے تحت لوگوں نے حقوق طلب کرنے شروع کیے اور آخر کار ۵۰۰ ق م کے لگ بھگ لوگوں نے حکمرانوں کے انتخاب، قانون سازی اور منصفوں کے تقرر کے پورے اختیارات حاصل کر لیے۔ لیکن پھر تیسری صدی قبل مسیح میں مقدونیہ کی طاقت ور بادشاہت کے آگے یونانی جمہوریتیں تاش کے پتوں کی طرح بکھر گئیں۔

● روم میں بھی ابتدائی شہر کے اشراف خاندانوں ہی کے ہاتھ میں اقتدار رکھی ہوتا تھا، مگر جوں جوں باہر سے زیادہ لوگ شہر میں آ کر آباد ہوتے گئے، حقوق کے لیے چیخ و پکار بڑھتی گئی۔ آخر کار ۵۱۰ قبل مسیح میں عام لوگوں نے تخت شاہی کو الٹ دیا۔ جنگ کے قابل تمام لوگ ہر سال جمع ہو کر دو کونسل (consul) منتخب کرنے لگے۔ مگر یہ تو جمہوریت نہ تھی کہ قابل جنگ لوگ (comitia curiata)، صرف اُمرا ہی ہوتے تھے۔ یہ گروہ سینیٹ کے ساتھ اقتدارِ اعلیٰ کا شریک ہوتا تھا اور سینیٹ، اشرافیہ کا ایک مختصر تر گروہ تھا جس کے افراد عمر بھر کے لیے اس کے رکن ہوا کرتے تھے۔ گو، روم کے عوام نے کئی دفعہ مقبول حکمرانی جمہوریت کے قیام کے لیے جدوجہد کی لیکن کسی قابل ذکر اور دیرپا کامیابی سے دوچار نہیں ہوئے۔ سینیٹر ہی فوج، اُمورِ خارجہ اور مالیات کو کنٹرول کرتے تھے۔ دراصل حکمران وہی ہوتے تھے۔

رومی سلطنت کے عروج اور فتوحات کی وسعت کے ساتھ بڑے سپہ سالاروں کا بھی عروج ہوا، جنہوں نے اپنی عسکری قوت کے بل بوتے پر مطلق اقتدار حاصل کر لیا۔ سینیٹ، فطری طور پر اُن سے حسد رکھتی تھی۔ ایسے سب سے بڑے سپہ سالار جولیس سیزر (۱۴۴-۱۰۰ء) نے سینیٹ کے اقتدار و اختیار کو تقریباً ختم ہی کر دیا، اور آخر کار سینیٹ کے جمہوریت پسندوں ہی کی سازش سے، جن کا قائد بروٹس تھا، وہ بالآخر قتل کر دیا گیا اور اس طرح سلطنتِ روما سے جمہوریت کا شائبہ تک ختم ہو گیا، کیوں کہ اس کے بعد مارک انطونی نے اسی طرح اقتدار سنبھال لیا۔

یہ سچ ہے کہ ہماری معلومہ تاریخ میں جمہوریت کا اصول سب سے پہلے یونانیوں نے دنیا

کو دیا تھا لیکن یونانی جمہوریت کیا تھی؟ انتہیز جیسی شہری ریاستوں میں جہاں آبادی کا تقریباً ایک تہائی حصہ غلاموں پر مشتمل تھا، صرف آزاد انسانوں ہی کو حق رائے دہی اور حق عہدہ حاصل تھا، کیوں کہ قانوناً یہی لوگ 'اصل شہری' تھے۔ خود ارسطو، جو اہل دانش کا شہزادہ کہلاتا ہے، اس بات کا قائل تھا کہ بربروں کو غلام بنانا بالکل درست ہے، کیوں کہ وہ ایک کم تر نسل ہیں۔ پھر اس یونانی جمہوریت کے کئی نقائص اور بھی تھے۔ 'براہ راست جمہوریت' ہونے کی بنا پر یہ زیادہ سے زیادہ ایک شہر ہی کے لیے قابل عمل ہو سکتی تھی۔ کسی بڑے ملک یا سلطنت میں اس کے نفاذ کا کوئی طریق نہ تھا۔ دوسرے یہ کہ ریاست کے انتظام میں تکنیکی امور، یہاں تک کہ مقدمات کے فیصلے اور انصاف تک، عوامی صوابدید پر چھوڑ دیے گئے تھے۔ چوتھی صدی قبل مسیح جو علم و دانش میں یونان کا عہد زریں شمار ہوتی ہے۔ اس عوامی جمہوریت تلے دم توڑتی ہوئی نظر آتی ہے۔ اسی بنا پر انتہیز کو فوجی مہمات میں شکست پر شکست ہوتی ہے، اور 'عوامی عدالت' کا سامنا کر کے سقراط کو جو پیغمبروں جیسی حکمت و دانش کا امین تھا، زہر کا پیالہ پینا پڑتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اس دور کے عظیم ترین مفکر، سقراط، افلاطون اور ارسطو اس نظام سیاسی سے سخت نالاں اور اس کے زبردست ناقد نظر آتے ہیں۔

بہر حال، یونانی طرز کی جمہوریت، جیسی بھی وہ تھی، نہایت عارضی ثابت ہوئی اور یورپ میں سیاسی اور فکری اقتدار رومیوں کے ہاتھ آیا، تو انھوں نے ایک طرح کی اشرافیہ اور بدترین ملوکیت کا نظام حکمرانی اختیار کیا، حتیٰ کہ حکمران سیزر کا نام ہی 'قیصر' کی صورت میں بادشاہی کا مترادف بن گیا۔

● ایشیا کی حالت اس سے کسی طرح بھی بہتر نہ تھی۔ یہاں کی دو اہم قومیں فارس اور ہند کی تھیں۔ اہل فارس کے ہاں کسی جمہوری روایت کی خبر نہیں ملتی۔ وہاں جابر بادشاہوں کے بڑھے ہوئے ظلم و ستم پر کبھی کبھی بغاوتوں کے شعلے ضرور بھڑکتے ہوئے نظر آتے ہیں، جیسے پانچویں صدی عیسوی (عہد ساسانی) میں مزدکیت کا فلسفہ پھیلتا دکھائی دیتا ہے، جس کے بانی مزدک کا خیال تھا کہ معاشرے میں دولت اور ازواج کی اشتراکیت ہونی چاہیے کہ یہ کسی فرد کی ذاتی ملکیت نہ رہیں، بلکہ ہر ایک کو ان سے استفادے کا حق ہو۔ ظاہر ہے کہ اس تعلیم کا اثر سیاسی، معاشی اور اخلاقی انتشار

اور نراج ہی کی شکل میں نکل سکتا تھا۔ خسرو نوشیرواں نے تلوار اور جبر کے زور سے اس عقیدے کو کچلا، تاہم اس وقت تک ہزاروں بچے ایسے پیدا ہو گئے تھے، جن کا نسب متعین کرنا ناممکن ہو گیا تھا، وراثت اور تملیک کیوں کر طے پائی۔ اب ملوکیت اپنے تمام لوازمات کے ساتھ پھر ایران کا نظام سیاسی و معاشی قرار پائی۔

● جہاں تک ہندستان کا تعلق ہے، نظام حکومت کا جمہوری اصولوں یا سیاسی حقوق سے کوئی دور کا بھی واسطہ نہ تھا۔ آریوں نے وسط ایشیا سے تقریباً ۲ ہزار قبل مسیح میں ہندستان میں قدم رکھا تھا۔ قدیم باشندوں کو دوردراز کے علاقوں اور پہاڑوں، جنگلوں میں دھکیل دیا گیا یا غلام بنالیا گیا۔ اس وقت سے مسلمانوں کی آمد تک ہندستان کئی فکری اور ذہنی انقلابوں سے دوچار ہوا۔ ویدوں کا عہد سیدھا سادا تھا جس میں طاقت و راجا اور سردار بے داد و ستد (ظلم کے ساتھ) حکومت کرتے تھے۔ معاشرہ چار طبقوں میں منقسم تھا، حکمران کھشتری ہوتے تھے، مذہبی مقتدر طبقہ برہمن، تجارت اور معاش میں سرگرم ویش اور محنت کش، کمترین طبقہ شودر، جن کے چھونے سے بھی اعلیٰ طبقے گریزاں تھے۔ بدھ مت اور جین مت نے بھی جو اس ظالمانہ نظام کے خلاف ایک تحریک کا حصہ کہے جاسکتے تھے، کوئی قابل ذکر کامیابی حاصل نہ کی، اور ایک طرح سے ہندومت میں ضم ہو گئے۔ اس طرح ہندستان کے عوام بھی موروثی سیاسی حکمرانی، مذہبی حکمرانی اور معاشی اقتدار کے بدترین نظام کے اسیر رہے۔

غرض دنیا میں کوئی ایسا فلسفہ نہ تھا، جو فرد واحد یا چند افراد کے ٹولے کے مطلق العنان اقتدار کو چیلنج کرتا، اور اس کے لیے کوئی مؤثر لائحہ عمل مہیا کرتا۔

قرآن کا فلسفہ سیاست

اس عہد میں قرآن مجید نے اعلان کیا اور یہ کتاب مقدس کا پہلا فقرہ ہے: **الْحَقُّ لِلَّهِ رَبِّ الْعَالَمِينَ** (الفاتحہ: ۱) ”تعریف اللہ ہی کے لیے ہے، جو تمام کائنات کا رب ہے۔“ گویا اقتدارِ اعلیٰ کسی فرد، خاندان یا گروہ کا نہیں، بلکہ اللہ ہی کا حق ہے:

ذٰلِكُمُ اللّٰهُ رَبُّكُمْ لَهُ الْمُلْكُ لَا اِلٰهَ اِلَّا هُوَ (الزمر: ۳۹) یہ اللہ ہے، تمہارا رب، اسی کی حکومت ہے، اس کے سوا کوئی معبود نہیں۔

لَهُ مُلْكُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ (الزمر ۳۹:۴۴) آسمانوں اور زمین کی بادشاہی کا وہی مالک ہے۔

پھر قرآن اعلان کرتا ہے کہ اللہ نے انسان کو زمین پر اپنا خلیفہ، یعنی جانشین بنا دیا ہے:
هُوَ الَّذِي جَعَلَكُمْ خٰلِفَافِ الْاَرْضِ (الانعام ۶:۱۶۵) وہی ہے جس نے تمہیں زمین میں اپنا نائب بنایا۔

یہ خیال رہے کہ یہاں پوری نسل انسانی سے خطاب ہے، کسی خاص قوم، نسل، یا طبقے سے نہیں۔ یہاں ہم دیکھتے ہیں کہ کسی اور مروج مذہب یا فلسفہ سیاسی میں پہلی بار تمام انسانوں کو یہ حق دیا جا رہا ہے کہ وہ زمین پر حقیقی مقتدر اعلیٰ کی نیابت کریں۔ اگرچہ یہ اقتدار اعلیٰ، موجودہ لادینی جمہوریت کی طرح مطلق العنان نہیں، بلکہ اللہ تعالیٰ کے تجویز کردہ اجتماعی نظام کا پابند ہے:
اَلَا لَهٗ الْخَلْقُ وَالْاَمْرُ (اعراف ۷:۵۴) آگاہ ہو جاؤ، تخلیق اور حکم دینا اسی کے لیے مخصوص ہے (یعنی اسی ذات پاک کا حق ہے)۔

قرآن مجید نے اپنے ماننے والوں کو حکم دیا کہ اپنے امور کا تصفیہ باہم مشورے سے کریں، اور اس طرح مطلق العنانی کا خاتمہ کیا۔ حضور اکرم اللہ تعالیٰ کی طرف سے مامور اور ہدایت یافتہ تھے، تاہم آپ کو بھی ہدایت کی گئی کہ معاملات میں اپنے ساتھیوں سے مشورہ ضرور کریں:
وَسَاوِرْهُمْ فِی الْاَمْرِ (ال عمران ۳:۱۵۹) اور دنیا کو بتایا گیا کہ حقیقتاً تو مسلمانوں کے معاملات باہمی مشورے ہی سے طے پاتے ہیں۔

وَأْمُرْهُمْ شُورٰی بَيْنَهُمْ (الشوریٰ ۴۲:۳۸) اُن کے (یعنی مسلمانوں کے) امور باہمی مشورے ہی سے انجام پاتے ہیں۔

اس طرح تاریخ میں پہلی دفعہ مطلق العنانی یا اشرافیہ کی من مانی کا ابطال کیا گیا اور شورا نیت کا حکم دیا گیا۔ لطف کی بات یہ ہے کہ شورا نیت کی یہ تلقین ایک مذہب کر رہا ہے، اور مذہب روایتی طور پر ایک حاکمانہ مزاج رکھتا ہے، نہ کہ جمہوری۔ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نہ صرف اللہ کے رسول بلکہ مدینہ کی پہلی اسلامی ریاست کے سربراہ بھی تھے۔ آپ سیاست، جنگ و صلح اور تمام ملکی انتظامات کے سلسلے میں اپنے اصحاب سے مشورہ فرمایا کرتے تھے۔ غزوہ احد کے

موقع پر جب یہ خبر ملی کہ کافروں کا بہت بڑا لشکر پوری جنگی تیاریوں کے ساتھ حملہ آور ہونے آ رہا ہے، تو آپ کی رائے یہ تھی کہ مدینہ ہی میں رہتے ہوئے مقابلہ کیا جائے، مگر آپ نے صحابہ کی رائے کو ترجیح دی، اگرچہ اس کے نتیجے میں مسلمانوں کا بہت نقصان ہوا اور بہت سی قیمتی جانیں گئیں۔

آپ کے بعد مسلمانوں نے سربراہ حکومت کا انتخاب بھی شورائی طریق پر کیا، اور خلیفہ (جو قرآن مجید کی اصطلاح کے مطابق اللہ کی زمین پر اللہ کے خلفا (جانشینوں) کا نمائندہ ہوتا ہے) کے انتخاب کے لیے بیعت کا طریق رائج ہوا۔ بیعت دراصل رائے دہی ہی کی ایک صورت ہے، اور کوئی شخص قانونی طور پر مسلمانوں کا امیر نہیں بن سکتا، جب تک مسلمانوں کی اکثریت اس کے انتخاب کے حق میں نہ ہو۔ رائے دہی کے جدید طریقے، ووٹ ڈالنا اور خفیہ رائے شماری۔۔۔ دراصل اسی اصول شورائیت و بیعت کے نفاذ کی جدید صورتیں ہیں۔ ظاہر ہے کہ اسلام کے قرن اول میں ان طریقوں کا استعمال ممکن نہ تھا۔

جدید مغربی جمہوریت

مغرب میں سیاسی حقوق کا شہرہ ۱۳ویں صدی عیسوی سے ہوتا ہے، یعنی قرآن مجید کی آمد کے ۷ سوسال بعد۔ جدید مغربی جمہوریت اگرچہ زیادہ 'جمہوری' نظر آتی ہے، کہ وہ اقتدار اعلیٰ کلیتاً عوام کو عطا کرتی ہے، مگر بڑی حد تک یہ محض کاغذ پر ایک رسمی دعویٰ ہے۔ ۱۲۱۵ء میں انگلستان کے بادشاہ جان کو کچھ نوابوں نے مجبور کیا کہ وہ حقوق کی 'عظیم دستاویز'۔۔۔ 'مگینا کارٹا' پر دستخط کر دے۔ لیکن سچ پوچھیے تو اب تک دنیا میں کسی ملک میں عوام کو حقیقی معنوں میں اقتدار نصیب نہیں ہوا ہے۔ یورپ میں نظریہ جمہوریت کے متوازی عہد نوآبادیات شروع ہوا۔ فرانس اور برطانیہ جیسی اقوام نے جو خود کو دور جدید میں جمہوریت و حریت کی علم بردار کہتی ہیں، براعظم ایشیا، افریقہ اور آسٹریلیا میں اپنی نوآبادیات قائم کیں۔ وہاں کے اصل باشندوں کے حقوق ملکیت، زمین و وسائل، رائے دہی اور حق آزادی کو پامال کیا، بلکہ تسلیم ہی نہ کیا۔ حد تو یہ ہے کہ بعض علاقوں سے اصل باشندوں کا تقریباً صفایا ہی کر دیا گیا، جیسے شمالی امریکا سے سرخ ہندی (ریڈ انڈین) اور آسٹریلیا سے وہاں کے قدیم باشندے۔ سوال یہ ہے کہ یہ کس سیاسی نظریے کی بنیاد پر ہوا؟ ۲۰ویں

صدی کے نصف آخر میں جن نوآبادیاتی قوتوں نے اپنے مقبوضات کو چھوڑا ہے، تو پھر برہنہ سیاسی اقتدار کے بجائے ایک نئی قسم کا سیاسی و اقتصادی غلبہ ان نوآبادیاتی مملکتوں پر مسلط کر دیا۔ یہ جدید نوآبادیاتی نظام (neo-colonialism) استحصال اور لوٹ مار کی ایک جدید خوب صورت شکل ہے۔ نام نہاد آزادی حاصل کرنے والے یہ ممالک اپنے آقا ملکوں کے قرض، تکنیکی مہارت اور توازنِ ادائیگی کے نہ ختم ہونے والے پکڑ میں مبتلا دکھائی دیتے ہیں۔

پھر جن ملکوں میں یہ جمہوریت پروان چڑھی ہے، وہاں بھی حریت و اقتدار حقیقی سے زیادہ سطحی ہے۔ جدید ریاستوں میں بھی سربراہ مملکت، عسکری قیادت اور مقتدرہ کو عدالت میں جواب دہی کے لیے نہیں گھسیٹا جاسکتا، جب کہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے اقتدار کے عروج میں اپنی پشتِ مبارک ایک دعوے دار کے لیے کھول دی تھی کہ وہ ایک چچی کا بدلہ لے لے، اور کسی کو کوئی دعویٰ ہو تو آپ مدد کرنے کے لیے تیار ہیں۔ حضرت عمرؓ (سربراہ مملکتِ اسلامیہ) برسرِ منبر اس اعتراض کا جواب دیتے ہیں کہ جو کچھ تقسیم کیے گئے تھے، وہ اتنے چھوٹے تھے کہ آپ کی قمیص نہ بن سکتی تھی، آپ نے کیسے بنائی؟ فرمایا: میرے بیٹے نے اپنا کپڑا مجھے دے دیا تھا۔

مغرب میں 'جمہوریت' کے عروج کے ساتھ صنعتی ترقی شروع ہوئی۔ اس کے نتیجے میں بڑی بڑی صنعتیں سلطنتیں (industrial empires) اور کارپوریشنیں وجود میں آئیں۔ قومی رقابتوں اور ان کے باہمی تصادم کے خطرے اور نتیجے کے طور پر ہول ناک عسکری قوتیں قائم کرنا ناگزیر ہو گیا۔ اور ان عسکری قوتوں کے لیے سامانِ حرب بھی لازم تھا۔ غرض صنعت کاروں، سرمایہ داروں، مقتدرہ اور سپہ سالاروں کی ٹولیوں نے جمہوریت کے پردے میں ناموسِ انسانیت کی بے حرمتی کا ایک نیا اسلوب اور کھیل شروع کیا، جو اب بھی جاری ہے۔ عراق اور افغانستان پر امریکا اور اس کے اتحادیوں کی یلغار اس کی تازہ مثال ہے۔

دپو استبداد جمہوری قبا میں پائے کوب

تو سمجھتا ہے یہ آزادی کی ہے نیلم پری (بانگِ درا)

معاشی نظریات کا تاریخی پس منظر

دولت کی منصفانہ تقسیم کا مسئلہ انسان کو درپیش اہم ترین مسائل میں سے ایک ہے۔ نزول قرآن کا پس منظر ملاحظہ کیجیے، تو معلوم ہوگا کہ اس طرف توجہ شاذ و نادر ہی کی گئی تھی۔ جہاں تک افلاطون کا تعلق ہے، اپنی 'جمہوریہ' میں وہ صرف 'حکمران فلاسفہ' ہی کے درمیان اشتہائیت اور نفی ملکیت کی تلقین کرتا ہے۔ بجا طور پر اس کا خیال ہے کہ مال و اسباب کی ہوس ہی سیاسی فساد اور مظالم کا باعث بنتی ہے، مگر یہ تو پوچھا جاسکتا ہے کہ اگر دولت مند اور با وسائل طبقے ہی ہوں اقتدار میں مبتلا ہو جائیں، تو انھیں حکومت پر قبضہ کر لینے سے روکنے والی چیز کیا ہوگی؟ جہاں تک قدیم ایران کے مزدک کا تعلق ہے، اس کی تعلیمات کے منتشر اجزا ہی ہم تک پہنچے ہیں اور ان سے اندازہ ہوتا ہے کہ اس کی تعلیمات پر عمل سے مزاج اور انتشار ہی کا راستہ کھل سکتا ہے۔

انسانی فکری تاریخ میں قرآن سے پہلے ان دو افکار سے پہلے کہیں یہ نظر نہیں آتا کہ دولت کی منصفانہ تقسیم کے لیے کوئی نظام دیا گیا ہو، جس سے معاشرے میں مفاسد کا قلع قمع ہو۔ ظلم، بے انصافی اور استحصال کا خاتمہ ہو، اور تمام انسانوں کی بنیادی ضروریات کی فراہمی کا انتظام، معاشرہ یا حکومت خود اپنے ذمے لے لے۔ قرآن مجید نے جو اسلامی نظام معاش تجویز کیا ہے۔ اس سے قبل دنیا کے تمام معاشروں میں اقتصادی نظام سخت غیر متوازن نظر آتے ہیں۔ ایک طرف تو پیدائش دولت اور دولت جمع کرنے پر کوئی پابندی نہیں تھی، دولت کمانے کے سلسلے میں جائز و ناجائز کی کوئی تفریق نہ تھی۔ اسی طرح اُسے خرچ کرنے پر بھی کوئی پابندیاں نہ تھیں، دوسری طرف ملک جابر اور سردار، جہاں اور جس طرح چاہتے اپنی رعایا کی دولت پر قبضہ کر لیتے۔ پیداوار دولت کا بنیادی ذریعہ، یعنی زمین، انہی کی ذاتی ملکیت ہوتا تھا۔ بعض معاشروں میں تو ستم بالائے ستم یہ تھا کہ معاشرے کو ایسے موروثی طبقات میں تقسیم کر دیا گیا تھا کہ بعض افراد اور ان کی اولاد کا مستقبل کبھی معاشی طور پر خوش آئند ہو ہی نہیں سکتا تھا، جیسے قدیم ہندو معاشرے کے شودر۔ اس کے برخلاف دوسرے طبقات کو غیر معمولی معاشی فوائد سے متمتع ہونے کا حق دار بنا دیا گیا تھا۔

قرآن کا معاشی فلسفہ

قرآن مجید نے ان تمام مفاسد کے انسداد کی تدبیر کے لیے دنیا کو ایک نیا معاشی نظام دیا۔ اگر آپ دولت کی پیدائش کے عوامل پر نظر ڈالیں تو ان میں دو عوامل نمایاں نظر آئیں گے:

۱- وسائل پیداوار ۲- محنت۔ آج معاشیات میں دو مزید عوامل، سرمایہ اور انتظام گنائے جاتے ہیں، مگر یہ بھی درحقیقت اول الذکر دو عوامل ہی کے تحت آسکتے ہیں۔

جہاں تک وسائل پیداوار کا تعلق ہے (جن کو کلاسیکی معاشیات میں 'زمین' کے عنوان کے تحت گفتگو کی جاتی ہے، اور اس میں زمین کے علاوہ سمندر اور آبی وسائل، جنگلات، معدنیات اور ہر طرح کے عطیات قدرت شامل ہیں) قرآن مجید کے بارے میں واضح اعلان کرتا ہے:

وَاللَّهُ مِيرَاتُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ (ال عمران ۱۸۰:۳، الحديد ۱۰:۵) آسمان اور زمین اللہ ہی کی ملکیت ہیں۔

اَلَا اِنَّ لِلّٰهِ مَا فِى السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ (یونس ۵۵:۱۰) یاد رکھو، آسمانوں اور زمین میں جو کچھ ہے، وہ اللہ ہی کی ملکیت ہے۔

چوں کہ وسائل پیداوار اپنی آخری تحلیل میں زمین ہی سے حاصل ہوتے ہیں، اس لیے قرآن مجید ان کے لیے 'ارض' استعمال کرتا ہے، کیوں کہ انسان اپنی محنت سے جو بھی دولت حاصل کرتا ہے، وہ زمین ہی سے آتی ہے، اور اگر کائنات کے دوسرے گوشوں (آفتاب) سے بھی آئے تو 'سموات' کی اصطلاح اسے بھی احاطہ کر لیتی ہے۔

جب دولت کا مصدر (source) فی الواقع اللہ ہی کی ملکیت ہے، تو اس پر انسان کو مالکانہ حقوق حاصل نہیں ہو سکتے۔ دراصل جب انسان کو زمین پر اللہ کا خلیفہ یا نائب کہا گیا ہے تو اس کا مطلب ہی یہ ہے کہ زمین پر اس کا اختیار مالکانہ نہیں، بلکہ ایک امانت دار ہی کا ہو سکتا ہے۔ زمین پر اللہ کی نیابت کوئی انفرادی معاملہ نہیں بلکہ ایک اجتماعی تصور ہے، یعنی بحیثیت کل۔ پوری انسانیت خلیفۃ اللہ فی الارض ہے۔ جدید لادینی تصور سیاست میں چونکہ اللہ کے تصور کو خارج از بحث رکھا جاتا ہے اس لیے اس میں اللہ کی جگہ ریاست لے لیتی ہے۔ یوں زمین اور سارے وسائل پیداوار دراصل ریاست ہی کی ملکیت قرار پاتے ہیں، یہ اور بات ہے کہ ریاست جن افراد یا اداروں کی ملکیت میں انھیں دے دیتی ہے، وہ اس پر مالکانہ تصرف کے مختار قرار پاتے ہیں۔

اگر صورت حال ایسی ہو تو ظاہر ہے کہ زمین سے حاصل ہونے والی پیداوار پر انسان کا حق نہایت محدود معنوں ہی میں ملکیت قرار دیا جاسکتا ہے۔ اسلام کے نزدیک وہ دراصل ایک

امانت ہے، اور امانت پر امین کا کُلی اختیار نہیں ہوتا۔ اُس کے لیے لازم ہوتا ہے کہ اصل مالک امانت کے منشا کے مطابق ہی اُسے استعمال کرے۔

اس نکتے کو قرآن مجید نے متعدد مقامات پر نہایت وضاحت سے بیان کیا ہے:

أَفَرَأَيْتُمْ مَا كَحَرْتُونَ ۝ إِيَّانْتُمْ بُرِّرْتُمْ وَأَنْتُمْ أَنْتُمْ الرِّعُونَ ۝ لَوْ نَشَاءُ لَجَعَلْنَاهُ حُطَامًا فَظَلْتُمْ تَفَكَّهُونَ ۝ إِنَّا لَمُعْرِضُونَ ۝ بَلْ نَحْنُ مَحْرُومُونَ ۝ أَفَرَأَيْتُمُ الْمَاءَ الَّذِي تَشْرَبُونَ ۝ إِيَّانْتُمْ أَنْزَلْنَاهُ مِنَ السَّمَاءِ لِيُشْرَبَ بِهِ ۝ لَوْ نَشَاءُ لَجَعَلْنَاهُ جُرَّاحًا فَلَوْلَا تَشْكُرُونَ ۝ أَفَرَأَيْتُمُ النَّارَ الَّتِي تُورُونَ ۝ إِيَّانْتُمْ أَنْشَأْتُمْ شَجَرَتَهَا أَمْ نَحْنُ الْمُنشِئُونَ ۝ (الواقعة ۵۶: ۶۳-۷۲) ذرا اُس کھیتی کو تو دیکھو جس کی تم کاشت کرتے ہو، کیا تم نے اُس (کے بیج) کو اُگایا، یا اُگانے والے ہم ہیں۔ اگر ہم چاہتے تو اُسے بھوسے جیسا بنا دیتے، اور تم ہاتھ ملتے رہ جاتے (اور کہتے) دراصل ہمیں دھوکا ہوا (کہ ہم اُسے اپنی محنت کا ثمرہ سمجھ رہے تھے)۔ فی الواقع ہم نامراد ہیں۔ پھر ذرا اُس پانی کو تو دیکھو جسے تم پیتے ہو۔ کیا تم اُسے بادل سے اتارتے ہو، یا برس آنے والے ہم ہیں۔ اگر ہم چاہتے تو اُسے کھاری ہی بنا لیتے۔ تو تم اس کا شکر یہ ادا کیوں نہیں کرے؟ ذرا اُس آگ کو تو دیکھو جسے تم روشن کرتے ہو۔ کیا تم نے اُس کا شجر اُگایا ہے، یا اُگانے والے ہم ہیں۔

اقبال نے قرآن مجید کے اس فلسفہ ملکیت کو اپنی نظم الارض لله میں یوں بیان کیا ہے:

پالتا ہے بیج کو مٹی کی تاریکی میں کون؟ کون دریاؤں کی موجوں سے اٹھاتا ہے سحاب؟
کون لایا کھینچ کر پتھم سے بادِ سازگار؟ خاک یہ کس کی ہے؟ کس کا ہے یہ نورِ آفتاب؟
کس نے بھر دی موتیوں سے خوشہ گندم کی موسموں کو کس نے سکھلائی ہے خورے انقلاب؟

وہ خدایا! یہ زمیں تیری نہیں، تیری نہیں

تیرے آبا کی نہیں، تیری نہیں، میری نہیں (ببال جبریل)

اب، چوں کہ جدید سیکولر ریاستوں میں اصل مالک زمین عوام ہیں، اس لیے اللہ کی جگہ

عوام یعنی ریاست نے لے لی ہے، اور سارے وسائل اپنے آخری تجربے میں ریاست کی ملکیت متصور ہوتے ہیں، اور اس لیے انھیں اُن کے مفاد ہی کے لیے استعمال کرنے کا دعویٰ کیا جاتا ہے۔ پیدائش دولت کا دوسرا اہم عامل 'محنت' کا ہے۔ اس میں شک نہیں کہ تمام انسان اپنی صلاحیتوں اور کارکردگی میں یکساں نہیں ہوتے، لیکن اگر کوئی بہتر صلاحیت رکھتا ہے، تو یہ بھی اللہ تعالیٰ ہی کی ودیعت ہے، اور محض اس بنا پر وہ کسی قدر زائد کا حق دار نہیں۔ ہاں، محنت کی کمی بیشی کی بنا پر معیشت میں فرق ہو سکتا ہے، مگر ظاہر ہے کہ یہ فرق ایک اور ایک ہزار یا لاکھوں کروڑوں کا نہیں ہو سکتا، جیسا کہ آج کے سرمایہ دارانہ نظام اور 'بے روک معیشت' میں ہم دیکھتے ہیں۔ اسلام نے قرآنی تعلیمات کی بنا پر اس فضیلت ذہنی و جسمانی کی بنا پر ایک گروہ کو دوسرے گروہ کا استحصال کرنے اور اُسے اپنے مقاصد کی تکمیل کے لیے آلہ کار بنانے کی اجازت نہیں دی ہے۔ اللہ تعالیٰ اگر اپنے بعض بندوں کو زائد رزق کے حصول کے مواقع دیتا ہے تو امین کی حیثیت سے ان کا فرض ہے کہ اُسے اپنے نسبتاً کم خوش قسمت بنی نوع پر خرچ کریں؟

وَاللّٰهُ فَضَّلَ بَعْضَكُمْ عَلَىٰ بَعْضٍ فِي الرِّزْقِ فَمَا الَّذِيْنَ فَضَّلْنَا بَرِآءِي رِزْقِهِمْ
عَلٰى مَا مَلَكَتْ اَيْمَانُهُمْ فَهُمْ فِيْهِ سَوٰٓٔىۤ اَفَبِعِزَّةِ اللّٰهِ يَجْحَدُوْنَۙ (النحل: ۱۶-۱۷)

اللہ تعالیٰ نے روزی میں تم میں سے بعض کو بعض پر برتری دی ہے، تو جنہیں زیادہ دیا گیا ہے، وہ اپنا رزق اُن لوگوں کو نہیں لوٹا دیتے جو اُن کے زیر دست ہیں، تاکہ وہ باہم مساوی ہو جائیں تو کیا وہ اللہ کی اس (نعمت) کا انکار کر رہے ہیں؟

یہاں ایک نکتہ قابل غور یہ ہے کہ بَرِآءِي رِزْقِهِمْ یعنی "اپنے رزق کو لوٹانے والے" کے الفاظ استعمال کیے گئے ہیں، اور لوٹائی وہ چیز جاتی ہے جس کے ہم حقیقی مالک نہ ہوں۔ اسی طرح ایک حدیث میں زکوٰۃ کی بابت ارشاد ہوتا ہے کہ یہ امیروں سے لے کر غریبوں کو لوٹائی جاتی ہے۔ گویا معاشرے کے پس ماندہ طبقوں کی امداد کے لیے اہل ثروت جو دیں گے وہ بھیک یا خیرات نہیں ہوگی، بلکہ محتاجوں کا حق ہوگا۔

اس طرح ہم دیکھتے ہیں کہ قرآن کے نزدیک ضرورت سے زائد تمام دولت معاشرے کے پس ماندہ طبقے کا حق ہے:

يَسْأَلُونَكَ مَاذَا يُنْفِقُونَ قُلِ الْعَفْوَ (البقرہ ۲: ۲۱۹) لوگ آپ سے پوچھتے ہیں کہ ہم (اللہ کی راہ میں) کیا خرچ کریں؟ کہہ دیجیے، وہ جو ضرورت سے زائد ہے۔ یہ بات اہم ہے کہ یہ سورہ بقرہ کی ایک آیت ہے، اور زمانہ نزول کے اعتبار سے آپ کی دی ہوئی ہدایات میں سے آخری ہدایتوں میں سے ہے۔

قرآن مجید کا تصور معیشت و ریاست خالصتاً فلاحی یعنی welfare کا ہے۔ وہ نہ صرف سرمایہ دارانہ استحصال کو روکتا ہے، بلکہ زر کے جمع کیے جانے والے اور اُسے اللہ کی راہ میں خرچ نہ کرنے پر وعید بھی سناتا ہے:

وَالَّذِينَ يَكْنِزُونَ الذَّهَبَ وَالْفِضَّةَ وَلَا يَنْفِقُونَهَا فِي سَبِيلِ اللَّهِ فَبَشِّرْهُمْ بِعَذَابٍ أَلِيمٍ ۝ يَوْمَ يُحْمَىٰ عَلَيْهَا فِي نَارِ جَهَنَّمَ فَمُكَّوئِي بِهَا جَبَاهُمْ وَجُنُوبُهُمْ وَظُهُورُهُمْ ۝ هَذَا مَا كَنَزْتُمْ لِأَنفُسِكُمْ فَذُوقُوا مَا كُنْتُمْ تَكْنِزُونَ ۝ (التوبة ۹: ۳۴-۳۵) وہ

لوگ جو سونا چاندی جمع کر کے رکھتے ہیں، اور انھیں اللہ کے راستے میں خرچ نہیں کرتے، انھیں ایک دردناک عذاب کی خوش خبری سنا دو۔ وہ ایسا دن ہوگا، جب انھیں جہنم کی آگ میں پگھلایا جائے گا، پھر ان سے ان کے پہلو اور کھالیں داغی جائیں گی۔ یہ ہے جو تم اپنے لیے جمع کر کے رکھتے تھے، تو اپنے اس جمع کرنے کا مزہ چکھو۔ اس طرح قرآن مجید معاشرے کے پس ماندہ طبقوں پر خرچ کرنے کو محض ایک نفل عبادت اور ثواب کا کام نہیں بنا دیتا، بلکہ اسے ایک فرض قرار دیتا ہے، جس کے سلسلے میں دنیا میں احکام ہیں اور آخرت میں محاسبہ۔

دور جدید

نظام سرمایہ داری کے مظالم اور تکالیف کا مداوا کرنے کے لیے مغرب میں جتنی بھی تحریکیں شروع ہوئیں، ان کی ابتدا فرانس اور جرمنی میں دیکھی جاسکتی ہیں۔ یہ امر قابل غور ہے کہ یورپ میں فرانس اور جرمنی ہی اولاً عربوں اور اسلام سے متاثر ہوئے تھے۔ جرمن فلسفی ایمانوئل کانت کو اخلاقی تعلیمات میں اسلام کی چھاپ نہایت واضح نظر آتی ہے۔ قدامت پسند چرچ کے ناقدین اور حریت اور شرف انسانی کے علم بردار اگرچہ کسی مذہب کا نام لینے سے گریزاں رہے، لیکن ان کی

بوجھ ہٹانے والی اور زنجیروں کو کاٹنے والی تحریروں میں قرآن کا رنگ جھلکتا ہوا محسوس ہوتا ہے۔ اس ضمن میں جو نظام تجویز کیے گئے ان کا نقطہ منتہا کارل مارکس اور اینجلز کی Manifesto اور اوٹول الذکر کی عہد آفریں کتاب سرمایہ (Capital) ہے جو ۱۸۶۷ء میں لکھی گئی تھی۔ ان کی تحریروں اور تحریک کے نتیجے میں ۱۹۱۷ء کا اشتراکی انقلاب روس آیا، جو بعد میں مشرقی یورپ کے کئی ملکوں اور مشرقی بعید چین تک پھیل گیا، اور دنیا کی ایک موثر سیاسی و معاشی قوت بن گیا۔ مارکس اور اینجلز نے صنعتی انقلاب کے نتیجے میں وجود میں آنے والے ظالمانہ نظام کی چکی میں پسنے والے طبقات کو لاکارا: ”دنیا کے محنت کشو! متحد ہو جاؤ، تمہارے پاس گنوانے کے لیے سوائے زنجیروں کے اور کچھ نہیں ہے۔“ لیکن ۱۰۰ سال سے بھی کم عرصے میں اس انقلابی تجربے کی عملی تعبیر نے روس میں بدترین آمریت اور تاریخ کے دہشت ناک ترین ادوار میں سے ایک کو جنم دیا۔ اس نظام نے اپنے زیر اثر افراد کی آزادیاں اخلاق اور بلند اقدار چھین لیے۔ اکثریت کو پست حیوانی سطح پر پہنچا دیا۔ جسمانی احتیاجات کی تو ضمانت دے دی گئی، لیکن وہ مقام چھین لیا گیا، جو انسان کو حقیقی شرف عطا کرتا ہے۔

تاہم، اس تحریک اور نظام کے ردِ عمل اور تعامل کے نتیجے میں مغرب کے بے قید سرمایہ دارانہ نظام میں تھوڑی سنجیدگی اور ذمہ داری کا احساس بھی پیدا ہوا۔ مزدوروں اور محنت کشوں کے حقوق کے لیے قانونی تحفظات مہیا کیے گئے، ان کی بہتر زندگی، صحت اور آسائش کی طرف توجہ ہوئی اور بہت سے ملکوں میں بے لگام معیشت پر کچھ پابندیاں عائد ہوئیں۔

مشرق کی طرف نظر ڈالیں تو بلاشبہ ابتدائی اسلامی دور حکومت کے بعد بادشاہوں اور نام نہاد خلفا کا دور کسی طرح بھی ظلم و استحصال سے پاک مثالی عہد قرار نہیں دیا جاسکتا۔ لیکن اُس وقت بھی، جب خلافتِ اسلامی زوال پذیر ہو کر ملوکیت کی شکل اختیار کر چکی تھی مسلمانوں کے ضمیر سے حقوقِ انسانی، عدلِ عمرانی اور معاشی انصاف کے قرآنی تصورات کو ہٹایا نہیں جاسکا۔ چنانچہ ہم دیکھتے ہیں کہ عباسی حکمران مامون کے عہد میں بھی امام ابوحنیفہ کے تلمیذ امام ابو یوسف جو ’کتاب الخراج‘ تصنیف کرتے ہیں، اس میں عوام کے سیاسی اور معاشی حقوق کی نہایت شعوری تلقین ہے، حالانکہ یہ ایک نسلی ملوکیت کا دور تھا، اور خلیفہ، خلیفہ نہیں بلکہ موروثی بادشاہ ہوا کرتا تھا۔

اس عہد میں قرطبہ، طلیطلہ، سیواکل اور غرناطہ کے مسلم مدرسوں میں عیسائی طلبہ اور علما کا استفادے کے لیے آنا اور علوم اسلامی کی خوشہ چینی ایک تاریخی حقیقت ہے، جس میں کسی شہے کی گنجائش نہیں ہے۔ تعلیمات قرآنی کے دُھندلے ہو جانے، اور عہدِ اڈل سے بُعد کے باوجود ۱۱ویں اور ۱۲ویں صدی عیسوی میں مسلم فکر و علوم کے ان اداروں سے اہل مغرب کا متاثر ہونا بالکل فطری تھا۔ 'ہسپانوی اسلام' کے ایک مؤرخ نے اُس عہد کے ایک عیسائی مفکر کو یوں نوحہ زن پایا ہے:

میرے عیسائی دوست، عربوں کی شاعری اور داستانوں ہی سے لطف اندوز ہوتے ہیں۔ وہ دین محمدی کے اہل دینیات اور فلاسفہ کی کتابوں کو زیر مطالعہ رکھتے ہیں۔ اس لیے نہیں کہ ان کا ابطال کریں، بلکہ مقصد یہ ہوتا ہے کہ اعلیٰ درجے کا عربی اسلوب اختیار کر لیں۔ افسوس! نوجوان عیسائی، جو اپنی صلاحیتوں کے اعتبار سے ممتاز ہیں، سوائے عربی کے کسی اور زبان اور ادب سے نا آشنا ہیں۔ وہ عربی کتابیں نہایت ذوق و انبھاک سے پڑھتے اور ان کا مطالعہ کرتے ہیں۔ زر کثیر صرف کر کے ان کے پورے کے پورے کتب خانے بنا لیتے ہیں۔ ہر جگہ وہ عرب داستانوں کے گیت گاتے نظر آتے ہیں۔^۳

ہمارے لیے یہ تو ممکن نہیں کہ اُن معاشی محرکات اور اصلاحات کا، جو آج کی دنیا میں مثالی بن چکی ہیں براہ راست قرآن کی اسلامی تعلیمات سے سراغ لگا سکیں، تاہم یہ تو ثابت شدہ امر ہے کہ یورپ میں نشأتِ ثانیہ اور تحریکِ اصلاح، مسلم فکر کے زیر اثر ہوئی تھی اور احیاءِ العلوم کی یہی حرکت آخر کار دورِ جدید کی پیدائش کا باعث ہوئی اور فلاحی ریاست (Welfare State) کا تصور تو خالصتاً اسلامی تصور ہے، کیوں کہ ایسے کسی تصور کا سراغ یورپ اور ایشیا کے کسی اور فلسفے میں نہیں تھا، جس نے دورِ جدید کی تشکیل میں حصہ لیا ہو۔ یہ تو جدید دنیا کی بد قسمتی ہے کہ اصولاً تو وہ اس تصورِ ریاست و معیشت کو اپنانے کا دعویٰ کرتی ہے، لیکن عملاً اس سے گریزاں ہے۔

حواشی

۱- شبلی نعمانی: سیرت النبی، جلد ۱، ص ۲۱۔ بعض نے اس روایت کو ضعیف قرار دیا ہے، تاہم صورتِ حال یوں ہی تھی کہ کمزور اور بے حقیقت لوگوں ہی نے دعوت کو قبول کیا تھا، اور اہل اقتدار اور بااثر لوگوں نے